© rasailojaraid.com

وہ سورج بن کر ابھرے گا

ڈاکٹر تحسین فراقی

گو چاروں سمت اندھیرا ہے
سورج کی آنکھیں اندھی ہیں، تاروں نے چہرے ڈھانپ لیے۔
گھبراؤ نہیں اے اہلِ یقیں
وہ شاہ بلوطِ انسانی، جو ظاہر میں کل ٹوٹ گرا
وہ سورج بن کر ابھرے گا۔

جی ہاں یہ کل کا سویرا، مستقبل کے کل کا سویرا ہے۔ ماضی کے کل کا سویرا نہیں۔ ماضی کے کل کا سویرا، ایک رسالہ بھی تھا۔ اس سویرے کا امتیاز صرف یہ تھا کہ زنگی کا نام کافور رکھ دیا گیا تھا۔ مگر مستقبل کے کل کے جس سویرے کا نعیم صدیقی نے ذکر کیا ہے، وہ ایک سپہ سالار سویرا ہے جس کی قیادت میں رسالہ در رسالہ جوق در جوق، انسانوں کا ایک گروہ ہے--- بے انت انسانوں کا گروہ--- حدود وثغور سے بے نیاز انسانوں کا گروہ۔ اس مستقبل کے سویرے کی ابتدائی علامت سورج ہے۔ جسے ابھرنا ہے۔ یہ نعیم صدیقی کا بھی ایمان ہے اور اس خاکسار کا بھی۔

مولانا مودودی ؒ کو ہم سے بچھڑے کئی برس ہو چکے۔ نمعلوم یہ ماہ و سال ابھی اور کتنی کروٹیں لیں گے اور لیتے رہیں گے۔ ماہ و سال کی ان کروٹوں کا سلسلہ کب سے جاری ہے اور کب تک چلتا رہے گا۔ اس کا حال کس کو معلوم سوائے اس ذات علیم کے جو بصیر بھی ہے اور خبیر بھی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بڑے لوگوں کے اٹھ جانے سے دل بیٹھ جاتے ہیں اور ساعتیں گراں گوش ہو جاتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے لمحوں کی آنکھوں سے بصیرت بھی چھن گئی ہے اور وہ لاٹھی ٹیکے آہستہ آہستہ اس طرح قدم اٹھانے لگتے ہیں جیسے حرکت نہ کر رہے ہوں بلکہ حرکت کی نفی کر رہے ہیں، لیکن ایسا [illegible] وقتی ہوتا ہے [illegible] کے بعد پھر یہ قوی احساس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگڑائیاں لے کر اٹھتا ہے۔ دھیرے اور دھیمے لہجے میں اس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ ''وہ سورج بن کر ابھرے گا۔''

سورج ایک علامت ہے، لیکن ایسی علامت جو واضح ہے، بین ہے، روشن ہے۔ ایسی نہیں کہ اس کے لیے مجھے ہبوطِ آدم سے ایں دم تک کی مثالیں لانا پڑیں، اور یا پھر سورج کی عہد بہ عہد کی اساطیری اور تقدیسی کلمات کی وضاحتیں کرنا پڑیں۔ یہ کام میں اپنی عمر سے بڑے بڑے نقادوں کے لیے چھوڑتا ہوں کہ ان میں سے ایک دو تو اس کام میں بڑے ماہر ہیں اور اب تک اس کام کی کمائی کھا رہے ہیں۔ اللھم زد فزد۔

شائد میں اپنے موضوع سے ہٹ گیا ہوں۔ ذکر ہو رہا تھا مرحوم و مغفور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ''جواب ہم میں نہیں ہیں جواب ہم سے دور چلے گئے ہیں، مگر فاصلہ زیادہ نہیں، بقول ناصر قریشی ایک سانس کا فاصلہ ہے کہ طے شود جادہ صد سالہ بآہے گاہے، مگر وہ ہم سے دور جا کر ہمارے اور قریب ہو گئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں اگر موت کا ہاتھ انہیں ہم سے جدا نہ کرتا تو ہمارے لیے انہیں زیادہ جامعیت، صحت اور کلیت سے دیکھنا ممکن نہ ہوتا۔ اشیاء کی طرح افراد بھی ایک قابل لحاظ فاصلے ہی سے زیادہ بہتر طور پر دیکھے جا سکتے ہیں، مگر اس بہتر طور پر دیکھنے کی قیمت بہت بھاری ادا کرنی پڑتی ہے۔ بڑی ہی زہرہ گداز، اعصاب شکن اور قلب سوز۔ مولانا بھی ہر شخص کی طرح فطرت سلیم کر پیدا ہوئے لیکن ان کا امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے کامیاب اور عمر بھر پور انقلابی زندگی گزاری اور ان کے لیے اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے تمام عمر ایمان کی دولت سمیٹی۔ اگر وہ کسی ارتکاز کے قائل تھے تو صرف ارتکاز ایمان کے۔ وہ ایک پکے ایمان دار اور سچے پاکستانی کی حیثیت میں دنیا سے رخصت ہوئے، ورنہ اس دنیا میں ایسے بدنصیبوں کی بھی کمی نہیں جنہوں نے جوانی کے ایام تو صالحیت میں گزارے مگر ادھر عمر کا آفتاب ڈھلنا شروع ہوا، ادھر ان کا ایمان ڈولنا شروع ہو گیا۔ ایسے لوگوں کی مثال میرے نزدیک اس شخص کی سی ہے جس نے بھوک پیاس کا کرب برداشت کر کے تمام دن روزہ رکھا مگر غروب آفتاب کے بعد اسے شراب سے افطار کر ڈالا۔ مولانا نے دین حقہ کی خدمت اور اس کی تبلیغ کے لیے جو زریں کارنامے انجام دیئے ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے صرف پاکستان یا مشرق وسطیٰ میں نہیں بلکہ دنیا کے ہر حصے میں، مگر یہ باتیں تو زیادہ تر قال کی ہوں گی۔ حال کی تو بات ابھی چند لوگوں ہی نے کی ہے، اور اس کی پہلی باضابطہ صورت اسی صفحے پر مشتمل فراقیہ نظموں کی صورت میں آئی ہے جو نعیم صاحب نے اپنے خون جگر سے لکھی ہیں۔

ہاں اس بات کا نعیم صاحب ہی کو علم یا اندازہ ہوگا کہ [illegible] کی ہوئی ہے یا نہیں اقبال تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہہ گئے ہیں کہ۔

تپ، شعلہ کم نہ گردد زِ گسستن شرارہ

ہاں دل میں سوزش اور کاہش ہو تو آنسوؤں کے پی جانے کو کون دانش مندی سے تعبیر کرے گا۔

سوزش بہت ہو دل میں تو آنسو کو پی نہ جا　　　کرتا ہے کام آگ کا ایسی جلن میں آب

اور پھر متاخر شعراء کے سرخیل حضرت حزین نے بھی تو کہا تھا کہ جب آہ کھینچ لیتا ہوں تو دل کو چین پڑ جاتا ہے یوں سمجھ لو کہ جب کمان سے جب تیر نکل جاتا ہے، تو کمان کو آرام مل جاتا ہے

کشم چو آہ، دل ناتواں بیاساید　　　خدنگ چوں سفری شد کماں بیاساید

اسی۔لیے نعیم صدیقی بھی کہہ اٹھتے ہیں کہ

یار و سکون و صبر ہے کچھ اور ہی مہیب　　　آہ و فغاں کا حشر اٹھاؤ کہ وہ چلے

کہتے ہیں کہ فراق کی شاعری بڑی شاعری ہوتی ہے مگر وہ فراق جو طویل رفاقت کے بعد میسر آئے۔ نعیم صدیقی صاحب کا مولانا سے ربط ضبط ایک دو دنوں، چار آٹھ ہفتوں دس بارہ مہینوں یا پندرہ بیس سالوں کا نہیں، چالیس پچاس سالوں کا تھا۔ان چالیس پچاس برسوں میں انہوں نے تحریک اسلامی کے سلسلے میں کیا کیا کشٹ جھیلے، کیا کیا دکھ اٹھائے، کیا کیا مصیبتیں برداشت کیں، کیا کیا کڑیاں جھیلیں۔یہ اپنی جگہ ایک الگ داستان ہے۔اتنی طویل رفاقت کے بعد دفعتہً جدائی کا حادثہ واقعی انسانی اعصاب کو ہلا کر رکھ دیتا ہے پھر نعیم صدیقی نے اپنی کتاب کے دیباچے میں مولانا کے کردار کے جس پہلو کو اشعاعیت یا RADIATION سے تعبیر کیا ہے، اس اشعاعیت کا بظاہر اچانک روپوش ہو جانا ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔چنانچہ نعیم صاحب کی ان نظموں کا کرب یہیں سے شروع ہوتا ہے۔نعیم صاحب کا تعلق مولانا سے لحم اور رضاعت کے رشتوں سے بلند اور الگ تھا صرف نظریاتی وابستگی کا رشتہ، یہی ایک ایسا اٹوٹ رشتہ تھا جو مولانا کے بچھڑ جانے کے بعد ٹوٹ نہیں گیا بلکہ مزید مضبوط ہو گیا ہے۔

بڑی شخصیتوں پر متفرق شعراء کی نظمیں مرتب شکل میں تو مل جاتی ہیں، لیکن ایک ہی بڑی شخصیت پر ایک ہی شاعر یا فنکار کی تخلیقی کاوشیں کم از کم اردو کی حد تک بہت کمیاب ہیں۔خصوصاً دینی شخصیات پر تو ایسی شعری دستاویزات بہت ہی قلیل ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی پر انور صابری کی نظموں اور مولانا ابوالکلام پر کمال احمد کی منظومات کے مجموعے دستیاب ہیں اگرچہ میری نظر سے نہیں گزرے۔ہاں ڈاکٹر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نذیر شہید پر جناب غافل کرنالی صاحب کا ایک وقیع مجموعہ میں نے ایک عرصہ پہلے دیکھا تھا جس میں تاثر کی شدت اور جذبے کی گہرائیاں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتی میں نے محسوس کی تھیں اور اب مولانا مرحوم و مغفور پر حضرت نعیم کا یہ گرانمایہ مجموعہ جسے میں اردو شاعری کے رثائی منطقے میں اعلیٰ مقام دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا، خصوصاً اس مجموعے میں بعض نظمیں تو ایسی ہیں جن سے انتخاب میرے لیے مشکل ہو گیا ہے مگر میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا ہوں کہ یہ مسئلہ میرا ہی نہیں میرے ملک کی حکومت کا بھی ہے

نعیم صاحب نے مولانا مودودیؒ کو راہبر، ہمسفر اور ہم نظر کے روپ میں بھی دیکھا ہے اور رفعت تاریخ کے مہتاب کے طور پر بھی۔ مجاہد دعوت حق کے طور پر بھی اور باغ دین کی مہار کے طور پر بھی، وہ عدل کی میزان بھی تھے اور صدق کا معیار بھی۔ عالم نو کے نقیب عظیم بھی اور رزم حق کی پکار بھی، عفو و حلم کے شبستان بھی اور خلق کی جوئبار بھی، زندگی کا شرف بھی اور اس کا وقار بھی۔ مولانا کی یہ تمام علمی، عقلی، نقلی، متکلمانہ اور مجاہدانہ حیثیتیں ایک طرف مگر اس کتاب کا بیشتر حصہ فراق کے منظر نامے سے مرتب ہوا ہے یوں لگتا ہے جیسے، دوست دوست سے بچھڑ کر ایک خلاء چھوڑ گیا ہے جس کو پر کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ یہ نظمیں دل کے اعماق سے نکلی ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولانا مرحوم کی تدفین سے تین چار گھنٹے قبل جب میں جناب نعیم صدیقی سے ملا تو میں نے انہیں گہرے کرب کے عالم میں پایا۔ ایسا کرب جو گویائی کی قوت بھی سلب کر لیتا ہے، ایک مسلسل چپ لگی ہوئی۔ متحجر سا جسم، متحیر آنکھیں، خاموش کبھی کبھی خلاؤں میں گھورتی ہوئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ سکوت کسی بڑے طوفان کا خیمہ ہے۔ یہ طوفان آیا اور اپنے ساتھ زندہ رہنے والی نظموں کا ایک تحفہ لایا۔ مولانا کی وفات کی روح فرسا خبر نے نعیم صاحب پر کیا اثرات مرتب کیے۔ انہی کی زبانی سنیے اور جذبے کی صداقت اور درد کی شدت ملاحظہ فرمائیے۔

دل پگھل پگھل گیا، جاں بکھر بکھر گئی
اک خدنگ سی خبر روح میں اتر گئی
خون جیسے جم گیا، قلب جیسے تھم گیا
زندگی کی آرزو ذہن میں ٹھٹھر گئی
چہرہ ہائے خند خند، گفتگو میں قند قند
وہ عجب انجمن دوستو کدھر گئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاخ ہر مژہ پہ آج سرخ سرخ پھول ہیں
موج رحلت حبیب گل کتر کتر گئی
کٹ گیا جگر جگر ،خوں چکاں نظر نظر
موجۂ نسیم آج کارِ تیغ کر گئی

اگر چہ اور نظموں کی طرح اس نظم میں بھی شاعر نے اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے تسکین کے بعض پہلو نکالے ہیں ،مگر غالب لے درد اور گداز کی ہے ، چنانچہ نظم کے آخری شعروں میں یہ کہنے کے باوجود کہ مولانا ان گنت قلوب کی دھڑکنوں میں زندہ ہیں اور موت ان کی زد میں آکر خود مرگئی ہے اور یہ کہ شرق وغرب کے ہر حصے میں ان کے جسم کی موت ہر شخص کی روح میں بجلیاں بھر گئی ہے اس نظم کا اختتام حزن اور ملال کی گہری دھند پر ہوتا ہے:

اس گھڑی نہ پوچھیے جانِ ناتواں کا حال
لطف شاعری گیا ،لذت ہنر گئی

پھر اسی مجموعے میں نعیم صاحب کی بعض نظمیں اتنی سادہ ہیں مگر اتنی پر معنی کہ ان پر بلا مبالغہ سہل ممتنع کی تعریف صادق آتی ہے یوں بھی جذبے کی زبان سادہ ہوتی ہے۔کہیں تصنع اور بناوٹ کا ہلکا سا گمان بھی نہیں گزرتا۔دھیمے لہجے کا نرم خطابیہ انداز جس میں شکایت نہیں صرف لجاجت ہے،اور ساتھ ہی ساتھ مولانا کے کردار کی عظمت کی جانب اشارے بھی۔

اے ہجر میں چھوڑ جانے والے ، بسمل پہ ذرا نگاہ کرنا
تھا مشغلہ کیا لطیف تیرا ، تزئین گل و گیاہ کرنا
کیا شان گل بہار نو تھی ، ہر خار سے بھی نباہ کرنا
کرنوں کا گزر گلوں میں جیسے ، شفقت سے ترا نگاہ کرنا
کتنے تھے ترے حسود بدخواہ ، ان سب کے بھلے کی چاہ کرنا
دن فکر میں سارا کاٹ دینا ، پھر ذکر میں شب پگاہ کرنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور پھر اسی نظم کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں ضبط کا ایسا اعلیٰ معیار نظر آتا ہے کہ شاعر آہ کرنے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ یہ ضبط و تمکین کتنے لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جب ان کے پیارے اُن سے بچھڑ رہے ہوں۔ اصل میں نعیم صدیقی کے ہاں یہ ضبط و تمکین دین اسلام کا عطیہ ہے

کیسا ہے یہ غم کہ آہ کرنا　　　لگتا ہے کوئی گناہ کرنا

سہل ممتنع کی شاعری کا ایک اور نمونہ دیکھیے، مگر یہاں بھی مولانا سے اپنی بے پناہ محبت کے ساتھ ساتھ مولانا کے کردار کی جھلکیاں بھی دکھائے جاتے ہیں۔ درد یہاں بھی موجود ہے، گداز کی کیفیتیں یہاں بھی موجود ہیں، مگر یہ درد اور گداز، نالہ و شیون اور تعزیہ و ماتم کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ پھر یہ بھی کہ کہیں کہیں ان کا انفرادی غم اجتماعی درد کا روپ بھی دھارتا دکھائی دیتا ہے۔

کس شہر سے آگیا بلاوا　　　کس دیس چلی تری سواری!
تھا نصف صدی کا ساتھ اپنا　　　فرقت کی گھڑی ہے کتنی بھاری
ہے مہر سکوت صبر لب پر　　　سینے میں چھپے ہیں زخم کاری
اک درد کا تند و تیز دریا　　　دلہائے تپیدہ سے ہے جاری
ماحول تھا جیسے ایک طائف　　　ہوتی رہی تجھ پہ سنگ بازی
اے شاہ قلوب فقر کیشاں　　　شاہوں پہ تھا فقر تیرا بھاری

ان حزینہ، فراقیہ نظموں میں بعض ایسی نظمیں بھی ہیں جہاں مولانا کی موت سے پیدا ہونے والا کربناک تحیر اجتماعی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صرف ایک فرد کا نام نہیں تھا۔ ایک تحریک کا نام تھا۔ اور اس تحریک سے وابستگی رکھنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ یوں تو مولانا کی موت کا غم ہر فرد بشر نے محسوس کیا ہوگا، مگر ان کی جماعت کے متعلقین کے لیے تو یہ واقعہ حادثہ فاجعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ مولانا کے جسد خاکی کے لاہور پہنچنے پر ان کی آخری زیارت کرنے والی پرنم آنکھوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر لاہور کی آنکھ نے پہلے کم کم دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ مولانا کی وفات کے بعد لاتعداد شکستہ دل متعلقین کے سائل چہروں کو کسی شافی جواب کی ضرورت تھی۔ نعیم صاحب نے اس ساری صورت حال کو بڑی فن کارانہ صورت میں پیش کیا ہے، شعوری اور تحت الشعوری یادوں کا ایک الاؤ روشن کیا ہے۔ تسکین اور تشفی کا سامان بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا ہے، اور بتایا ہے کہ بچھڑنے والے سے ملنے کی کیا صورت ہے:—

طویل راہوں سے آنے والو، بڑے تحیر سے دیکھتے ہو
قریب آؤ، بتاؤ، سمجھاؤ، کس سے کیا چیز چاہتے ہو
پتا یہ تم کس کا پوچھتے ہو، وہ کون ہے جسکو ڈھونڈتے ہو
وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

وہ اک مفکر، وہ اک مدبر، خدا کی آیات کا مفسر
دماغ کے تجزیہ پہ قادر، قلوب کے تزکیہ کا ماہر
طویل راہوں پہ جا چکا ہے، وہ منزل خلد کا مسافر
وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

وہ شخص اب اک سحر کی صورت، جہاں میں پھیلا ہوا ملے گا
رہ خدا کے سپاہیوں کی، دعاؤں میں وہ رچا ہوا ملے گا
ستیزہ گاہوں میں جاں لڑاؤ، وہاں وہ خود تم سے آ ملے گا
وہ شخص اب، یاں نہیں ملے گا

نعیم صدیقی صاحب کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ مولانا کا ان کی زندگی میں صحیح عرفان قوم کو حاصل نہ ہو سکا، لیکن انہیں یقین ہے کہ جب اسلام کی تعلیمات عام ہو جائیں گی، دلوں کے قبلے اپنی صحیح سمت اختیار کر لیں گے تو مولانا کے پیغام کا اور قدر و کلام کا صحیح اندازہ ہوگا۔ نعیم صدیقی صاحب کے لہجے کا تیقن ملاحظہ کریں:

نظام اسلام آئے گا جب، تو اس کا تازہ ظہور ہوگا
جہاں میں شور نشور ہوگا، وقوع محشر ضرور ہوگا
وہ دے گیا ہے خبر سحر کی، اندھیرا باطل کا دور ہوگا
وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

نعیم صاحب نے مولانا مودودی کو ان کی فکری، دینی، روحانی اور اخلاقی فیض رسانی کی وجہ سے ایک مقدس، سرسبز، سایہ دار درخت سے تشبیہ دی ہے۔ اردو ادب کے علاوہ دیگر ادبیات عالم میں بھی فیض رساں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شخصیات کے لیے درخت کی علامت یا استعارہ استعمال کیا جاتا رہا ہے نعیم صاحب نے مولانا کو درخت طوبیٰ کہا ہے اور طوبیٰ کا لفظ خوشبو پاکیزگی، بشارت، فرحت، سب کا جامع ہے:۔

وہ اک شجر تھا مثال طوبیٰ، تم اس کی چھاؤں میں بیٹھتے تھے
دلوں کے دکھ درد کھولتے تھے، سوال پیچیدہ پوچھتے تھے
پھر اس حکیم حلیم سے سن کے، حرف اخلاص جھومتے تھے
وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

درخت کی یہی علامت نعیم صاحب کی ایک اور نظم میں شاہ بلوط کے طور پر آئی ہے نعیم صاحب نے مولانا کو شاہ بلوط کے عظیم اور جلالت آب درخت سے تمماثل ٹھہرایا ہے میرے خیال میں یہ نظم جو اس مجموعہ میں شاہ بلوط ہی کے نام سے شامل ہے، اس مجموعے کی نمائندہ ترین نظم ہے سب سے موثر، سب سے خوبصورت، تمثالوں اور علامتوں کے اعتبار سے یہ نظم اردو کی چند بہترین آزاد نظموں میں سے ایک کہی جاسکتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ تحت الشعوری یادیں فنکار کا بہترین سرمایہ ہوتی ہیں یہ یادیں حال سے ماضی قریب اور پھر ماضی بعید کی طرف مراجعت کرتی ہیں اور ماضی سے پھر حال اور پھر مستقبل کی طرف لوٹتی ہیں اسی طرح کہ زمانی حدیں بھی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں ۔ مولانا مرحوم کی یاد نعیم صاحب کے لیے کسک بنتی لگتی ہے۔ایک انمول کسک ایک نادر عطیہ:

وہ شاہ بلوط بھی ٹوٹ گرا
شب تارے جس پر جھومتے تھے
انبوہ روپہلی کرنوں کے، دن ٹہنی ٹہنی گھومتے تھے
اور تتلیاں بن کر لالہ و گل، نازک سی پھننگوں کو اس کی وارفتہ
ادا سے چومتے تھے

وہ شاہ بلوط جو اونچا تھا، قامت میں جو مثل طوبیٰ تھا
ایک ننھی کونپل کی صورت، وہ خاک فسردہ سے ابھرا
اک گلشن مردہ سے ابھرا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حوریں اسے سینچا کرتی تھیں، قدسی اسے پالا کرتے تھے

قد اس کے تنے کا بڑھتا گیا پھیلی ہیں مسلسل شاخیں بھی

آخر وہ فضا میں چھانے لگا

اس تیرگیوں کی دنیا میں وہ نور وضیا پھیلانے لگا

وہ شاہ بلوط تھا سایہ فگن

ہم جب بھی عشق کی راہوں پر چلتے ہوئے تھک کر آتے تھے

ہم جب بھی محاذِ حق سے کبھی تمغے کئی تازہ زخموں کے

سینوں پہ سجا کر لاتے تھے

اس شاہ بلوط نوری سے، کچھ دیر کو ٹیک لگاتے تھے

حساس شجر کے سامنے پھر، میدان کا حال سناتے تھے

کچھ جنگ کے راز بتاتے تھے

تھا ممتا کا ماحول یہاں، کچھ اونگھ سی آنے لگتی تھی

پل بھر کے لیے سو جاتے تھے

خوابوں کے جزیروں کی پریاں۔ پھر ہم کو اڑا لے جاتی تھیں

فردا کے خواب دکھاتی تھیں

ہم جانے کہاں کھو جاتے تھے

جنگاہ سے پھر آواز آتی۔ ہم چونک کے پھر اٹھ جاتے تھے

اس شاہ بلوط نوری سے کچھ تازہ قوت پاتے تھے

نغمات رجز پھر گاتے تھے

پھر اٹھ کر سینہ تانے ہوئے، میداں کو پلٹ کر جاتے تھے

پھر تازہ رنگ جماتے تھے

کہاں تک نقل کرتا جاؤں۔ اس نظم میں مولانا کی حیات سے وفات تک کے پورے تموجات بند ہیں، یوں کہیے کہ ان کی تحریکی زندگی کا عصارہ افشردہ کاغذ پر نکال کر رکھ دیا ہے۔ نعیم صاحب نے اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے جو اسلوب چنا ہے، وہ رومان اور تحیر، خواب اور اسرار سے گوندھ کر تیار کیا ہے۔

پڑھنے والا اس داستانی اسلوب کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کالرج کا بوڑھا ملاح اپنی طویل خوابناک کہانی کہتا ہوا اپنے سامع کو اپنی مکمل گرفت میں لے لیتا ہے۔ غرض یہ کہ اس مجموعے پر بسیط حزنیہ لے کے محیط ہونے کے باوجود، رجائیت کے نقش بھی کچھ کم گہرے نہیں۔ رجائیت کے لفظ کو ترقی پسندوں نے اتنا رگیدا ہے کہ مجھے یہ ترکیب استعمال کرنے میں تامّل ہوتا ہے۔ بہرحال میں اس ترکیب کو ایمانی قوت اور یقین کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی رویے کے طور پر استعمال کر رہا ہوں اور نعیم صاحب کے یہاں بھی یہ رنگ اسی ایمانیات کا نتیجہ ہے۔ یہ وہ رجائیت نہیں جو معاش اور معاشقے کے سنگم پر جنم لے کر پیٹی او پٹمزم کا روپ دھار لے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ نعیم صدیقی صاحب کو بحیثیت شاعر نظر انداز کرنے والے اس شعری مجموعے کا مطالعہ ضرور فرمائیں تاکہ ان پر کھلے کہ سچے جذبے جب شاعری میں ڈھلتے ہیں تو کس طرح احساسات میں آگ لگا دیتے ہیں۔

☆☆☆

© rasailojaraid.com